شمارہ ۱۱۳
مارچ ۱۹۷۳ء

کپور مارکیٹ۔ لکھنؤ

ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر: شمیم الدین
کتابت: وقار رضوی
طباعت: نامی پریس

ترسیل زر کا پتہ
منیجر ماہنامہ کتاب
کپور مارکیٹ، لکھنؤ

منور قیصر

سماج کا ٹینڈر

خواتین کے لکھے ہوئے گھریلو رومانی ناول اور افسانے پڑھنے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ ان کے ہیرو اور ہیروئنوں کو اگر کسی سے گلہ شکوہ ہے تو وہ صرف سماج کے ٹھیکیداروں سے ہے۔ یہ ٹھیکے دار عین اس وقت فریقین کے درمیان دیوار کھڑی کر دیتے ہیں جب شربتِ دیدار ختم ہونے کے بعد شربتِ وصل پینے کی باری آتی ہے۔ یہ الہ دین چراغ والے دیو کی طرح اتنے چابک دست نڈر اور بے شرم ہوتے ہیں کہ ان خوبصورت ناموں والی کنواریوں کی خواب گاہوں میں بھی جا دھمکتے ہیں جو اڑن کھٹولوں پر بیٹھ کر آنے والے شہزادوں کی خوشبو اپنے خیالوں میں رچا کے نیلگوں چاندنی میں مدہوش ہوتی ہیں۔ یہ ٹھیکیدار نقشہ منظور کروائے بغیر جہاں چاہتے ہیں ایسی دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں جو بظاہر تو نظر نہیں آتیں مگر پیار کے پنچھی ان پر بیٹھ کر مدتوں جدائی کے گیت گاتے رہتے ہیں۔ یہ ٹھیکے دار اپنے ٹینڈر منظور کروائے بغیر ایسے چکر چلاتے ہیں کہ حسن و عشق کے دو متوالے پیار کے کڑوے کوس طے کرنے کے بعد جب ثمرِ عشق کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو ان کے ہاتھ خود بخود پیچھے کھنچ جاتے ہیں اور وہ ـــ ایک ندی کے دو کنارے ملنے سے مجبور ہو کر ایک دوسرے کو بہن بھائی سمجھنے لگتے ہیں۔

سماج کے ٹھیکیداروں کی اس پراسرار دنیا کا مجھے کبھی پتہ نہ چلتا اگر یہ گھریلو رومانی ناول پڑھنے کا موقع نہ ملتا۔ یہ موقع بھی یوں پیدا ہوا کہ میرے سالے کے ہاں پہلوٹھی کی بیٹی پیدا ہوئی تو اس کی ساس نے نام رکھنے کا فرض مجھے سونپ دیا۔ میں نے دوسرے روز ہی ناموں کی ایک فہرست پیش کر دی جس میں فاطمہ، رسولاں، رشیدہ بیگم، بسم اللہ بیگم، رضیہ خاتون، گل پری، نسیمہ اور اے۔ ایل۔ سی اور سے ملتا جلتا اے۔ پی۔ سی خاتون ایسے نام شامل تھے۔ ناموں کی طویل فہرست دیکھنے کے بعد میرے سالے کی ساس نے پہلے ناک چڑھائی پھر ناک

پھر عینک چڑھائی اور کہنے لگی۔

"نئے ٹمنھ تیرا۔ کوئی ایسا نام بتاؤ جیسا مہرلی بی نے اپنی بیٹی کا رکھا ہے۔"

مہرلی بی نے اپنی بیٹی کا ایسا نام رکھا تھا جس نام پر ایک فلم سلور جوبلی کر چکی ہے۔

میں نے جواب دیا۔ "خالہ اس کے لئے تو کچھ انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ مجھے سلور جوبلی قسم کے ناول پڑھنے پڑیں گے اس وقت تک آپ اسے بے بی کہیئے۔"

خالہ مان گئی۔ تین ماہ کے مسلسل مطالعے کے بعد میں نے ناموں کی ایک فہرست پیش کر دی جس میں سے خالہ کو ایک ایسا نام بھلا لگا جو کسی ناول میں نہیں تھا اور میں نے اپنی طرف سے لکھا تھا۔ یہ نام نیواگن جو ملیریا کی ایک دوا ہے لیکن میں نے اس کے معنی یہ لکھے تھے

"ایسی ملکہ جس کا نام نیون سائن کی طرح چمکتا رہے۔"

ان رومانی گھریلو، نفسیاتی اور سماجی ناول پڑھنے کے بعد جب سماج کے ٹھیکیداروں کے کاروبار کا علم ہوا تو مجھے سخت غصہ آیا اور میرا جی چاہا کہ میں ان کی ایسوسی ایشن کو خط لکھوں اور صرف یہ جملہ لکھوں "اوئے بندے کے پتر بنو۔" مگر مجھے اس ایسوسی ایشن کا ایڈریس معلوم نہ تھا۔ آخر ایک روز پوچھتے پچھاتے میں سماج کے پی۔ ڈبلیو ڈی کے دفتر پہنچ گیا۔ استقبالیہ میں ایک مسکین صورت کلرک نے مجھے پہلے نیچے سے اوپر دیکھا۔ پھر ایک رجسٹر میں میرا نام اور پتہ لکھنے کے بعد مجھے ایگزیکٹو انجینئر کے کمرے میں بھیج دیا۔ ایگزیکٹو انجینئر نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "سوری ابھی ہم نے کوئی ٹینڈر طلب نہیں کئے۔"

میں نے کہا۔ "معاف کیجئے میں ٹینڈروں کے بارے میں پوچھنے نہیں آیا۔ مجھے صرف سماج کے ٹھیکیداروں کی ایسوسی ایشن کا پتہ مطلوب ہے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شاید آپکو علم نہیں کہ ہمارے منظور شدہ ٹھیکیداروں کو ایسوسی ایشن بنانے کی اجازت نہیں۔"

"تو پھر کسی ایک ٹھیکیدار کا ہی پتہ بتا دیجئے۔ میں صرف اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

ایگزیکٹو انجینئر نے میری بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا

"یہ کوئی پرابلم نہیں۔ ایسے ٹھیکیدار تو ہر چوک اور ہر موڑ پر مل جاتے ہیں۔"

میں ان کا شکریہ ادا کر کے واپس آگیا۔

کئی روز کی کوشش کے بعد مجھے گوہر مقصود تو نہ مل سکا البتہ ایک پرانا دوست گوہر علی مقصود ضرور مل گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یار یہ تو بتاؤ یہ سماج کے ٹھیکیدار کون ہوتے ہیں؟"

کہنے لگا۔ "اتنا بھی معلوم نہیں تمہیں۔ بڑے معزز لوگ ہوتے ہیں وہ۔"

"کیسے معزز؟" میں نے پوچھا

وہ بولا۔ "معزز ہونے کی نشانیاں ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی معزز وہ ہوتے تھے جن کے نام کے ساتھ الحاج لگا ہوتا تھا مگر آج کل معزز وہ ہے جس کے گھر کی چھت پر ٹیلی ویژن انٹینا نصب ہو۔"

دوسرے دن میں نے اپنی کوٹھے پر چڑھ کر دیکھا کہ شیخ علم دین کا بیٹا شیخ قدرت اللہ اپنے کوٹھے پر ٹی وی انٹینا کے نیچے کھڑے ہو کر ماسی رحمت کی بیٹی کو اشارہ کر رہا ہے مجھے خیال آیا کہ ضرور یہ بھی سماج کا ایسا ٹھیکیدار ہے جو پہلے وہ غلط ملبے پھر جبہ ان کی دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔

میں نے ماسی رحمت کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اس سے کہا۔ "ماسی اپنی بیٹی کو ذرا کنٹرول میں رکھو ورنہ سماج کے ٹھیکیدار اسے نگل جائیں گے۔"

ماسی رحمت نے شیخ زادے کو موٹا اسامی سمجھتے ہوئے فوراً مجھے کہا۔ "تم لڑکی کے ماں لگتے ہو کیا۔؟"

میں چپ ہو گیا اور اس کے بعد ماسی رحمت سے اسی روز ملاقات ہوئی جب اس کی لڑکی سماج کی چنی ہوئی دیوار میں نقب لگا کر شیخ قدرت اللہ کے ساتھ فلم کی ہیروئن بننے چلی گئی۔ شیخ علم دین ماسی رحمت کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "قدرت اللہ سے یہ کیا ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا ہے۔"

ماسی رحمت کو تو بیٹی واپس مل گئی مگر مجھے کوئی سماج کا ٹھیکیدار نہ ملا۔ ہر زمانے انسان کی طرح ان کے بھی قدموں کے نشان تو ضرور ملتے ہیں لیکن خود نظر نہیں آتے۔ ویسے یہ یقینی بات ہے کہ ان کا وجود ہے ضرور ورنہ تمام خواتین ناول نگار ان کا ذکر اتنے اعتماد سے نہ کرتیں۔ میں نے

سوچا یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ٹھیکیدار صرف خواتین ہی کو نظر آتے ہوں۔ اس خیال سے میں کالج کی ایک ایسی طالبہ سے ملا جس کے افسانوں کے اختتام پر یا تو ہیروئن مر جاتی ہے اور ہیرو اس کی سنگِ مرمر کی قبر پر نرگس کے پھول چڑھاتا ہے یا پھر ہیرو ہیروئن سماج کے ٹھیکیداروں کی بنی ہوئی دیوار کے آس پاس کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو بہن بھائی بنا لیتے ہیں۔"

میں نے اُس سے پوچھا۔ "محترمہ۔ آپ کے ہیرو اور ہیروئن کو آخر کیا مار پڑ جاتی ہے کہ وہ اچھل اچھل محبت کرتے کرتے بہن بھائی بن جاتے ہیں؟"

میرے اس استفسار پر وہ یوں شرمائی جیسے میں نے اس کے اصلی ہیرو کا نام پوچھ لیا ہو۔

میں نے پھر کہا۔ "آخر یہ سماج کے ٹھیکیدار کہاں رہتے ہیں۔ میں تمام ہیروئنوں کی طرف سے ان کے خلاف سول کورٹ میں حق زناشوئی کا دعویٰ دائر کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کیا خبر۔"

"تو پھر ڈر ڈر کر کیوں لکھتی ہیں آپ۔"

"مجھے اپنے ماں باپ سے ڈر لگتا ہے۔"

ماں باپ سے ڈرنا بیٹیوں کا اخلاقی فرض ہے لیکن ماں باپ کا بھی فرض ہے کہ وہ ہر لحظہ لڑکیوں پر لاٹھی چارج ہی نہ کرتے رہیں۔ اس سلسلے میں سماج کا بھی کچھ فرض ہے لیکن سماج کو کہاں ڈھونڈا جائے وہ بھی تو اپنے ٹھیکیداروں کے ساتھ لاپتہ ہے اس سائنس کی دنیا میں سماج بھی ایک سائنسی علم بن چکا ہے۔ اس کے کوائف جاننے کے لئے میں نے سوشیالوجی کی ایک لکچرر سے جب استفسار کیا تو وہ کہنے لگی۔

"میں سماج کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"تو پھر آپ کس کے بارے میں جانتی ہیں۔"

اس نے اپنی کنپٹی پر چمکتے ہوئے سفید بالوں کو سیاہ بالوں میں چھپاتے ہوئے جواب دیا۔ "صرف اتنا جانتی ہوں کہ مجھے اپنا جہیز مکمل کرنا ہے۔"

اس کی اس سچائی کا پتھر میرے دل پر آ کر لگا۔ پھر بھی میں نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو آپ شادی کر رہی ہیں۔" جیسے شادی کرنا بھی کوئی گناہ ہو۔

وہ بولی۔ "آخری عمر میں کوئی سہارا تو چاہیئے۔"

"کیا آپ اپنی شادی میں سماج کے ٹھیکے داروں کو بھی مدعو کریں گی۔"

اس نے کچھ توقف کے بعد جواب دیا۔ "جی میری شادی سماج کے ایک ٹھیکیدار سے ہی ہو رہی ہے۔"

"کیا میں اس سے مل سکوں گا۔؟" میں نے کہا

"کیوں نہیں۔ انتظار کیجئے۔" اور وہ یہ کہہ کر چلی گئی کہ کلاس میں لڑکیاں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔

گرمیوں کی ایک تپتی سہ پہر کو میں سڑک کے کنارے کھڑا ٹیکسی کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے ایک انٹرنیشنل قسم کے ہوٹل میں "اسلام اور صحت مند سماج" کے موضوع پر ہونے والے ایک مذاکرے میں شریک ہونا تھا۔ ٹیکسی کا انتظار کرتے کرتے جب میں مایوس ہو گیا تو ایک تانگا قریب آ کر رکا۔ اس میں تین سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ تانگہ بان نے مجھ سے چلنے کے لئے کہا تو میں نے ٹال دیا۔ وہ اندر کی بات سمجھتا ہوا بولا۔ "بابو جی ٹیکسی تو ہوائی چیز ہے تانگہ کوئی ایسی چیز تو نہیں کہ اس سے نفرت کی جائے۔ آخر آپ کے بزرگ بھی تو بیٹھتے رہے ہیں۔" میں کوئی دلیل دیئے بغیر تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے دو شخص باتیں کرتے ہوئے مہنگائی کا رونا رو رہے تھے۔ پہلے تو تانگے والا خاموشی سے باتیں سنتا رہا پھر اس نے مڑ کر ایک سواری سے پوچھا۔ "بابو جی کتنی آمدنی ہے؟"

وہ بولا۔ "تین سو روپے پگار ملتی ہے۔"

تانگے والا سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔ "بابو جی اگر چبا کر کھائے جائیں تو ختم نہیں ہوتے۔"

اس پر وہ شخص یوں پھنکارا جیسے کسی نے سانپ کی دم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ کہنے لگا۔

"پہلوان ہم تو اتنا چباتے ہیں کہ اب تو دانت بھی گھسنے لگے ہیں۔ یہ بات انھیں سناؤ جو بڑے بڑے انگریزی ہوٹلوں میں بیٹھ کر روپیہ بہاتے ہیں۔"

"کون ہیں وہ؟" میں نے یونہی پوچھا۔

"ٹھیکے دار اور ٹھیکہ دینے والے۔"

فضا میں تلخی سی دیکھ کر میں چپکا ہو رہا بہر حال اتنا سراغ ضرور مل گیا کہ سماج کے ٹھیکے دار کہاں پائے جاتے ہیں۔ مذاکرے میں سگرٹوں کے دھوئیں میں بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئی۔ تعلیم اور شعور کا ارتقا اصولوں کا منطقی تجزیہ کیا گیا لیکن کسی نے سماج کے ٹھیکیداروں کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ جہاں بیمار سماج ہو وہاں صحت مند ٹھیکے داروں کا ہونا لازمی ہے۔ مذاکرے کے اختتام پر جب جیّد اور ثقہ قسم کے مقررین کٹی ہوئی پتنگوں کی طرح ڈولتے ہوئے باہر نکل گئے تو ایک پردے کی ڈوری تھامے ہوئے بیرے سے میں نے پوچھا۔

"یہاں ٹھیکے دار کہاں ہوتے ہیں؟"

اس نے انگریزی میں کہا۔ "ہوٹل کے ٹھیکے دار؟"

"نہیں سماج کے ٹھیکے دار۔"

"پتہ نہیں جی۔ ویسے آپ بائیں ہاتھ مڑ کر داہنی طرف مینی تو لاؤنج میں چلے جائیں۔"

اس لاؤنج کی دنیا اور باہر کی دنیا میں صدیوں کا فاصلہ تھا۔

یوں معلوم ہوا کہ میں کسی الف لیلیٰ ماحول میں آ گیا ہوں۔ ہر طرف ملکی وے Milky way آرکسٹرا کی دھنوں کی پھوار پڑ رہی تھی بے فکری کو تجسیم کی صورت میں دیکھ کر احساس ہوا کہ شاید یہ سب لوگ چاند سے اتر کر آئے ہیں۔ ہلکے نیلے رنگ کے شیشوں سے بنی ہوئی میزوں کے گرد چاند ہی چاند بیٹھے ہوئے تھے جن کے ہونٹوں پہ سرخ رنگ کا شہد لگا ہوا تھا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کوئی جان پہچان والا نظر آ جائے لیکن وہاں تو شناسا چہرے بھی ایسے روپ میں تھے جیسے انہوں نے مجھے کبھی نہ دیکھا ہو۔ میں ایک ایسی ٹیبل کے پاس چلا گیا جہاں کوئی خاتون نہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان سب نے مجھے "بیٹھو" کہہ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں شکریہ کہہ کر بیٹھ گیا۔ اور ان سے پوچھنے لگا۔

"کیا آپ سب ٹھیکے دار ہیں؟"

ایک نے لائم جن کا گلاس اٹھائے ہوئے جواب دیا۔ "آدھے ٹھیکہ دینے والے اور آدھے ٹھیکہ لینے والے۔"

"آپ سماج کے بھی ٹھیکے دار ہیں۔" میں نے پھر پوچھا۔

"وہ کون سا محکمہ ہے؟" ایک نے استفسار کیا۔

دوسرے نے یونہی جملہ لڑھکا دیا۔ "ہو سکتا ہے سی۔ ڈی۔ اے نے کوئی نیا محکمہ کھولا ہو۔"

"آپ کو ہم سے کوئی کام ہے۔؟" ایک نے مجھ سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مجھے سماج کی مرمت کروانی ہے۔"

اس پر سب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ اور ان میں سے ایک بولا۔

"مرمت کا کام تو راج مزدور کرتے ہیں۔"

میں جب یہ کہہ کر اٹھنے لگا کہ "معاف کیجئے میں نے آپ کو پریشان کیا۔" تو ایک نے میرا بازو پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "بیٹھئے جی۔ گولی ماریئے سماج کو۔ یہ کوئی جگہ ہے جہاں ٹھیکے داری کی بات کی جائے۔"

دوسرا بولا۔ "یہ تو موج میلہ کرنے کا موقع ہے جی —— مرغیاں کوئی روز روز تو نہیں پھنستی ہیں۔"

میں بیٹھ گیا تو ایک پتنگ کی طرح دبلے پتلے شخص نے میرے سامنے سکاچ کا گلاس رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے کہا کچھ کھاؤ پیو اور جان بناؤ۔"

مجھے اپنے آپ پر اور ان پر اس قدر غصہ آیا کہ میں اسی غصے میں وہ گلاس اٹھا کر غٹا غٹ پی گیا۔ انہوں نے گلاس اور دیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھ پر اس چوہے والی کیفیت طاری ہو گئی جو شراب کے مٹکے میں گر پڑا تھا اور باہر نکل کر غصے سے بولا تھا۔ "کہاں ہے کمبخت بلی اسے میرے سامنے پیش کرو۔"

میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ "کہاں ہیں سماج کے ٹھیکے دار انہیں میرے سامنے پیش کرو۔"

میرے اس جملہ پر وہ پھر ہنسے اور ان میں سے ایک نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کر ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھی ہوئی چار خواتین کے سامنے پیش کر دیا۔ خواتین کی خوشبو سونگھ کر میرا نشہ بالکل اسی طرح ہرن ہو گیا جیسے مرگی کے مریض کو جوتا سنگھا دیا جاتا ہے۔ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے ہی والا تھا کہ ایک زیادہ پکے ہوئے آم جیسے جسم والی خاتون نے کہا۔

"پلیز بیٹھئے۔ ہم تو پہلے ہی سے بور ہو رہے ہیں۔"

"تنہائی" میں نے سوچا۔ جہاں زمین پر چاندی ہی چاندی بکھری ہو، وہاں تنہائی کیسی مگر میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر وہ کپڑوں، شادیوں، غیر ملکی دوروں اور سوشل ویلفیئر امیر رشتوں کی باتیں کرنے لگیں اور میں خاموش بیٹھا ہوا بھنی ہوئی مونگ پھلی کھاتا رہا۔

اتنے میں ایک بھرپور جوان خاتون داخل ہوئی جو شاید سیدھی سوئمنگ پول سے چلی آرہی تھی اس کے بال گیلے تھے اور نہانے کے لباس پر اسکارلٹ گاؤن پہن رکھا تھا سب نے اسے ہیلو ہیلو کہا میں نے بھی اپنے آپ کو انٹرنیشنل محسوس کرتے ہوئے مضافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے چاندی میں گندھا ہوا ہاتھ ملاتے ہوئے کہا

"جیلو" وہ یوڈی کلون میں رچی ہوئی تھی۔

وہ بھی وہاں بیٹھ گئی۔ خدا جانے کہاں کہاں کی باتیں ہونے لگیں۔ گفتگو میں شریک ہونے کے لئے میں نے اپنے بارے میں بہت سی جعلی باتیں کیں۔ اصل میں وہ جل پری مجھے بہت پسند آگئی تھی۔ میں نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہوٹل سے باہر کی دنیا کو بہت برا بھلا کہا۔ پیرز کی تعریف کی۔ بیٹلز کو سراہا۔ اینگری مین کی توصیف کی۔ اس سے دو ایسے ڈائیلاگ بولے پھر میں یکلخت یوں چپ ہو گیا جیسے بڑی سڑک سے ملنے والی چھوٹی سڑک کے موڑ پر کار کو بریک لگا دیا جاتا ہے۔ جل پری بولی۔ "ہنی تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ڈیئر مجھے سماج کے ٹھیکے داروں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ وہ تمہارے اور میرے درمیان جدائی کی دیوار کھڑی کر دینگے۔"

"وٹ جدائی۔ کیسی دیوار۔ آل نان سنس" جل پری نے دیوار کے ساتھ کھڑے ہوئے بیرے کو اشارے سے بلاتے ہوئے کہا۔

"سماج کے ٹھیکے دار بڑے ظالم ہوتے ہیں۔"

"ڈونٹ وری۔ میرے ڈیڈی ان سب کے ٹینڈر کینسل کر دینگے۔ چھوٹے موٹے لوگوں سے کیا ڈرنا ــــ وہ خود ہمارے محتاج ہیں۔"

"میں محتاج ہوں۔" میرے منہ سے نکل گیا

ایک ہنس کر بولی۔ "تو کیا کسی یتیم خانے سے نکل کر آئے ہو؟"

"جی ہاں۔ سماج کے یتیم خانے سے۔" میں نے جواب دیا۔

اس پر سب نے اس زور سے قہقہہ لگایا کہ سب لوگ مڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ اور پھر خواہ مخواہ ہنسنے لگے۔

جل پری نے اپنے گیلے بالوں کو جھٹک کر کہا۔ "پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

"ہنس کی چال چلنے آیا تھا۔"

جل پری کے منہ سے آگ نکلنے لگی۔ میں اپنی چال یاد کرنے کے لئے واپس اپنی اس گلی میں آگیا جہاں میرا ہمسایہ سڑک پر چارپائی بچھا اپنی چھوٹی بیٹی کے ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

دوسرے روز مجھے سماج کے پی۔ ڈبلیو ڈی کی طرف سے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ ہم آپ کو انتہائی مسرت سے مطلع کرتے ہیں کہ آپ کا ٹینڈر منظور ہو گیا ہے۔ حالانکہ میں نے دفتر استقبالیہ میں صرف اپنا نام اور پتہ ہی درج کروایا تھا۔

غزلیں

سید عابد علی عابد

کچھ تسلی بہرِ دل ہائے اسیراں ہو تو ہو
چشمِ حسرت روزنِ دیوارِ زنداں ہو تو ہو
اس طرح دیکھا ہے گُل پریوں کو خم بہرِ سلام
کوئی محفل میں نصیبے کا سلیماں ہو تو ہو
کیسا جلوہ تھا کہ تپ کر یار کُندن ہو گئے
میں نہ کہتا تھا وہی برقِ دل و جاں ہو تو ہو
کیا پُر افشاں ہے تجلی خاک سے افلاک تک
اس ادائے نور میں ظلمات پنہاں ہو تو ہو
عاشقی کی رمز کیا سمجھیں گے اب یارانِ بزم
بے غلط پن کا ترجماں چاکِ گریباں ہو تو ہو
نغمہ پرداز و یونہی بیکار ہے سازِ خیال
چھیڑنے کو اس کے مضرابِ رگِ جاں ہو تو ہو
صورتِ گل گو اسیرِ خاک بھی ہے یہاں
ہاں ہمارا خوں ترے کوچے میں ارزاں ہو تو ہو
گو غلط انداز ہے لیکن نگاہِ ناز ہے
کوئی پیکاں آج پیوستِ رگِ جاں ہو تو ہو
کیا ہوا آئی قفس میں جو میں سن سے رہ گیا
ہم صفیرو آمدِ فصلِ بہاراں ہو تو ہو
تنگیِ غم پر فشارِ غم کی لعنت مستزاد
بے جا ہے درد میرے دل کا درماں ہو تو ہو
ہم صفیر تازہ ہے آوازۂ دار و رسن
آج عابد بر سرِ محفل غزل خواں ہو تو ہو

احسان دانش

شکوہ سرائے جورِ حریفاں نہیں ہیں ہم
آلامِ زندگی سے پریشاں نہیں ہیں ہم
کانٹے کی طرح چشمِ دلِ دوستاں میں ہیں
ہر چند سربلند و نمایاں نہیں ہیں ہم
کس دن ہمیں نصیب ہوا ہو سکوں کا سانس
کب حادثوں سے دست و گریباں نہیں ہیں ہم
وہ چشمِ مست ہم کو پکارے تو چپ رہیں
اتنے تو جبر خواہِ دل و جاں نہیں ہیں ہم
ہم ہیں امینِ فطرتِ آدم خدا گواہ
جو ہم سمجھ رہے ہیں وہ انساں نہیں ہیں ہم
جو چاہے آ کے جنسِ تمنا خرید لے
اتنے بھی شہرِ عشق میں ارزاں نہیں ہیں ہم
یہ آئینے نظر سے گزرتے ہیں رات دن
وہ ہم سے کھنچ گئے ہیں تو حیراں نہیں ہیں ہم
جو کر سکیں نہ آنکھ ملا کر کسی سے بات
وہ چشم پوشِ محفلِ یاراں نہیں ہیں ہم
دل میں وہ جذب ہے نہ نگاہوں میں وہ اثر
شاید کہ اب وہ پہلے مسلماں نہیں ہیں ہم
ہم جس طرف چلیں تو ستارے چلیں نہ ساتھ
وہ کوچہ گردِ شہرِ نگاراں نہیں ہیں ہم
ہر شعلہ رنگ و بو ہی جدا ہو نہ کس طرح
کیا اپنی آگ میں سوزاں نہیں ہیں ہم
ہونٹوں پہ آنسوؤں کے تبسم کو دیکھ کر
وہ یہ سمجھ رہے ہیں پریشاں نہیں ہیں ہم
دانش غلط نویس ہیں منکر نکیرِ دہر
منقار زیرِ پر ہے غزل خواں نہیں ہیں ہم

غزلیں

احمد ندیم قاسمی

نہ ظلمتِ شب میں کچھ کمی ہے نہ کوئی آثار ہیں سحر کے
مگر مسافر رواں دواں ہیں ہتھیلیوں پر چراغ دھر کے
حصارِ دیوار و در سے میں نے نکل کے دیکھا کہ اس جہاں میں
ستارے جب تک چمک رہے ہیں چراغ روشن ہیں میرے گھر کے
میں دل کا جامِ شکستہ لاؤں کہ روح کی کرچیاں دکھاؤں
میں کس زباں میں کہیں سناؤں جو مجھ پہ احساں ہیں شیشہ گر کے
نئی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی تقدیر خود لکھے گا
بس اب عجائب گھروں میں رکھ دو قدیم معیار خیر و شر کے
بہشت کی نعمتیں ابھی تک ندیم کے انتظار میں ہیں
کہ اب بھی ذرّے چمک رہے ہیں فلک پہ آدم کی رہگزر کے

■■

علی جلیلی

آنکھ بھر آئی مری ساقی بہار آنے کے ساتھ
اور بھی اک جام چھلکا تیرے پیمانے کے ساتھ
آج بھی کھلتے ہیں دل میں آپ کی یادوں کے پھول
کتنے وابستہ ہیں گلشن ایک ویرانے کے ساتھ
فکرِ ظلمت کیوں کروں میں دل مرے ہمراہ ہے
یہ دیا خود جل اٹھے گا شام ہو جانے کے ساتھ
اور بھی موسم کی مستی ہوتی جاتی ہے سوا
وہ بھی کھلتے جا رہے ہیں زلف کھل جانے کے ساتھ
کاش میں لے لوں بہاروں سے پرانا انتقام
تم بھی آ جاؤ جو ساغر ہاتھ میں آنے کے ساتھ
اے علی بارِ تبسم بھی نہ ہم سے اٹھ سکا
آ گئے آنکھوں میں آنسو بھی ہنسی آنے کے ساتھ

■■

غزلیں

عبدالحمید عدم

دلبروں کی دیکھ کر خورسند ہے
آنکھ میری کتنی دولت مند ہے

بلبلے کا بانکپن تو دیکھنا
ایک قطرے میں سمندر بند ہے

میری جاں سے اتنی لاعلمی نہ رکھ
تجھ کو تیری جان کی سوگند ہے

چین کی دشمن ہے چنتا کی ہوا
بے نیازی میں بڑا آنند ہے

لوبھ میں کتنا بھی امرت کیوں نہ ہو
خوبصورت سانپ کا فرزند ہے

جن سے ملتی تھی دوائے دردِ دل
ان دواسازوں کا دفتر بند ہے

مے بھی کیا جلاد شے ہے اے عدم
کس قدر کڑوی ہے پھر بھی قند ہے

●●

باقی صدیقی

کرم ہے ہم پہ تیری اک نظر بھی
مگر یوں زندگی ہوگی بسر بھی

جو لے جاتی ہیں ہاتھوں پہ سفینہ
انہی موجوں سے بنتے ہیں بھنور بھی

عنایت ایک تہمت بن نہ جائے
نظر کے ساتھ جھک جائے نہ سر بھی

ترے نغموں میں بھی کھویا ہوا ہوں
لگے ہیں کان دل کے شور پہ بھی

چلا ہاتھوں سے دامانِ تمنا
ذرا اے سیلِ رنگ و بو ٹھہر بھی

لہو میں تر ہیں کانٹوں کی زبانیں
کسی کو ہے گلستاں کی خبر بھی

لو اب تو دل کے سناٹے میں باقی
ہوا شامل سکوتِ بام و در بھی

●●